پروفیسر حمید احمد خاں

امریکا میں غالب صدی کی تقریبات

فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات دنیا کے مختلف ممالک میں منائی گئیں۔ اِن ممالک میں سرِ فہرست ہندوستان اور پاکستان تھے مگر عالمِ انسانیت کے بڑھتے ہوئے تہذیبی تعلّق کا ثمر سمجھیے یا بین الاقوامی سیاسی مصلحتوں کا کرشمہ کہ رُوس اور امریکا بھی غالب کی شاعری اور شخصیّت کو یاد کرنے والی قوموں کی برادری میں شامل ہو گئے۔ متعدّد امریکی شعرا نے پاکستان کے ایک سخنداں کی مدد سے غالب کی اُردو غزلیّات کا انگریزی ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ اِس ترجمے کا نمونہ ایک مختصر سے رسالے کی شکل میں ایشیا سوسائٹی، نیویارک، نے "ہڈسن ریویو" کی اعانت سے شائع کیا ہے۔ دراصل غالب کی غزلوں کے یہ امریکی ترجمے، غالب کے تصوّرات کی بنیاد پر، مذکورہ امریکی شعرا کے اپنے تخیّل کی جولانیاں پیش کرتے ہیں اور صحیح معنوں میں ترجمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ تاہم اِس طریقِ کار سے یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ امریکا میں جو لوگ اب تک غالب کے نام سے ناآشنا تھے، اُن کے ذہنوں میں غالب کی فنّی و فکری عظمت کا ایک دھندلا سا شعور پیدا ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال دسمبر کے مہینے میں ایشیا سوسائٹی (نیویارک) نے فیصلہ کیا کہ امریکا کی چند منتخب یونیورسٹیوں میں مرزا غالب کی جلالتِ قدر کا اعتراف لیکچروں کے ایک سلسلے کی صورت میں کرایا جائے۔ اس موقع پر لیکچروں کے ایک سلسلے کے بجائے لیکچروں کے دو سلسلے کہنا شاید صحیح تر ہو، کیونکہ ایک لیکچرار کے بجائے دو لیکچرار اس غرض سے مدعو کیے گئے، یعنی پروفیسر محمد مجیب، وائس چانسلر جامعۂ ملّیہ (دہلی) کو ہندوستان میں دعوت گئی اور راقم الحروف کو اسی قسم کی دعوت لاہور میں موصول ہوئی۔ دعوت نامے میں یہ تصریح بھی تھی کہ کہیں کہیں ہم دونوں کا ایک ہی تقریب میں موجود ہونا ممکن ہے لیکن بالعموم ہمارا خطاب مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں الگ الگ جلسوں سے ہو گا۔ چنانچہ میں خود یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو امریکا پہنچ گیا مگر صورت یہ پیش آئی کہ پروفیسر مجیب سے میری پہلی ملاقات ۲۲ر اپریل کو شکاگو میں ہوئی۔ ۲۵ر اپریل کو شکاگو سے مجیب صاحب اور میں اکٹھے نیویارک آئے۔ جہاں میرے دورۂ غالب کی آخری تقریب ۲۸ر اپریل کو ہوئی۔ اس سے اگلے دن میں واپس وطن روانہ ہو گیا

جنوری ۱۹۷۰ء میں جب میں نے ایشیا سوسائٹی کی دعوت قبول کی تو سوسائٹی نے بلا تاخیر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اپنے لیکچروں کے لیے اپنی پسند کے دو یا تین موضوع چن لوں اور سوسائٹی کو ان عنوانات سے آگاہ کر دوں۔ میں نے ایشیا سوسائٹی کی خواہش کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے لیکچروں کے لیے حسب ذیل تین عنوان مقرر کیے:

(۱) غالب کی شاعری کا پہلا دور۔

(۲) غالب میں مضمون اور ہیئت کا امتزاج (شاعر نے اپنے خیالات صنفِ غزل میں کس طرح سموئے؟)۔

(۳) غالب کا تصوّرِ حُسن و عشق۔

ایشیا سوسائٹی کے متعلقہ شعبے کی مہتمہ کا یہ طریقِ کار اس لحاظ سے بہت سلیقہ مندانہ تھا کہ مختلف اداروں کو اپنی اپنی تقریب کے لیے حسبِ دلخواہ اِن تین عنوانات میں سے کسی ایک عنوان کے انتخاب کا موقع مل گیا۔ بعض جگہ (جہاں میرے قیام کی مدّت نے اس کی اجازت دی) ایک کے بجائے دو عنوان پسند کیے گئے۔ بعض تعلیم گاہوں (مثلاً ایری زونا یونیورسٹی اور گیٹس برگ کالج) میں مجھ سے خواہش کی گئی کہ مقررہ عنوانات سے قطع نظر کر کے بعض عام موضوعات پر بھی لیکچر دوں جیسے "برِّ عظیم پاکستان و ہند میں تحریکِ آزادی کا پس منظر" یا "برِّ عظیم کی اسلامی تہذیب کے نمایاں عناصر"۔ اس کے علاوہ یہ صورت بھی پیش آئی کہ بعض مقامات پر اس بات کا لحاظ کر کے کہ میرے اکثر سامعین مرزا غالب سے سرسری واقفیت بھی نہیں رکھتے، میں نے خود اپنے لیے ایک نیا مضمون تجویز کر لیا: "غالب، شخص و شاعر"۔ چنانچہ برکلے اور ٹیکساس یونیورسٹیوں میں مجھے یہی طریقِ کار اختیار کرنا مناسب معلوم ہوا۔

دراصل امریکا کے اکثر تعلیمی ادارے اُردو اور فارسی کے تہذیبی پس منظر سے ابھی تک بیگانہ محض ہیں، اور اس پس منظر سے شناسا ہوئے بغیر غالب جیسے شاعر و حکیم کا سمجھنا اور سمجھانا اگر محال نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ امریکا کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں اور تمدّنوں کا مطالعہ قدرۃً امریکا کی عالمی سیاست کی ضروریات کے تابع ہے۔ مشرقیات کے شعبوں میں نصابی مضامین کی حد بندی جغرافیائی بنیادوں پر کی گئی ہے، تہذیبی اور تمدّنی بنیادوں پر نہیں۔ خود ان علمی مراکز کے ناموں ہی سے کسی حد تک اُن کے طریقِ کار کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً "علومِ مشرقِ وسطیٰ"۔ "علومِ مشرقِ اقصیٰ"۔ "علومِ ایشیائے جنوبی"۔ "علومِ ایشیائے جنوبی و شرقی" وغیرہ۔

یہی صورت دو صدی پہلے کے انگلستان میں پیش آئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی آج تک السنۂ مشرقیہ کی آنرز ڈگری میں فارسی و عربی کے ساتھ سنسکرت کو ملاتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ برطانوی ہند میں سنسکرتی اور عربی علوم ایک ہی متحدہ رقبے میں پائے گئے تھے، چنانچہ لارڈ میکالے نے اپنی ۱۸۳۵ء کی تعلیمی رُوداد میں ان مختلف و متضاد علوم کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا ہے۔ اس طریق کار میں اُس وقت تک کوئی قباحت نہیں ہوتی جب تک کسی علاقے میں کسی ایک ہی تمدن کا دور دورہ ہو۔ لیکن سب کو معلوم ہے کہ تاریخی عوامل کرۂ ارض کی جغرافیائی اور تمدنی وحدت کے درمیان بار ہا ایک خلیج بن کر حائل ہو جاتے ہیں، جیسے بیسویں صدی کے اشتمالی انقلاب نے یورپی تمدن کے ابتدائی اتحاد کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اب یہ ممکن نہیں رہا کہ یورپ کی جغرافیائی وحدت کو ایک ہی تمدنی وحدت کی علامت قرار دیا جائے۔

با ایں ہمہ یہ مذکور الصدر "علاقہ جاتی مطالعے" بھی امریکا کے تحقیقی اداروں میں اپنی جگہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً کیلی فورنیا یونیورسٹی (برکلے) میں ساٹھ پینسٹھ برس سے علوم ایشیائے جنوبی کا مرکز قائم ہے جہاں اس سلسلے میں ایک بہت بڑا ذخیرۂ کتب جمع کیا جا چکا ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس مرکز کے محققین نے ہندی زبان کی ترقی کے لیے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ نیز بھارتی ادب، بھارتی فلسفہ و تاریخ، بھارت کے سیاسی کردار اور بھارت کے کسانوں کی زندگی کے مطالعے میں خاص کاوش کی ہے۔ اسی طرح یہ مرکز انڈونیشیا، تھائی لینڈ، فلپین اور ویت نام کے علاقوں پر اہم کام کر رہا ہے۔ چنانچہ کیلی فورنیا یونیورسٹی جن متعلقہ مضامین میں ڈگریاں دیتی ہے اُن میں حسب ذیل موضوعات شامل ہیں: علم الانسان، فنونِ لطیفہ، تقابلی ادبیات، معاشیات، جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات اور السنۂ مشرقیہ۔ (یہاں السنۂ مشرقیہ" سے مراد انڈونیشی، ملائی، تھائی، ویت نامی وغیرہ زبانیں لینی چاہئیں)۔

میں نے برکلے کے مرکز ایشیائے جنوبی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ اس تفصیل کی روشنی میں غالب کی اُردو اور فارسی شاعری کے تعارف کی مشکلات ناظرین کرام پر واضح ہو جائیں۔ جن دس مقامات پر مجھے لیکچروں کے لیے جانے کا اتفاق ہوا اُن سب میں تو نہیں مگر اُن میں سے بیشتر مقامات میں مجھے احساس ہوا کہ اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ یہاں کسی قدر ضمنی یا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ذکر سے امریکی درسگاہوں کو قصوروار ٹھہرانا مقصود نہیں ہے۔ یہ درسگاہیں دنیا کے دوسرے سرے پر

وہ سب کچھ کر رہی ہیں جو ممکن العمل ہے۔ اور پھر اسلامی علوم و فنون کو یہاں درجۂ دوم یا سوم کا جو مقام حاصل ہے، ممکن ہے اس میں ہماری غفلت کو بھی کسی نہ کسی حد تک دخل ہو۔ ہمارے اہل علم میں سے بہت کم لوگوں نے مغربی دنیا کو قابل توجہ سمجھا ہے۔ میرا سرسری اندازہ یہ ہے کہ ان درسگاہوں کو جہاں دس بھارتی استاد اور محقق میسر ہیں، وہاں انھیں بمشکل ایک پاکستانی اُستاد نصیب ہوتا ہے۔ یہ محض بھارت اور پاکستان کی کثرت و قلت آبادی کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دونوں ملکوں کے ذوقِ اجتہاد اور شوقِ جہادِ علمی کا معاملہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ بھارت کے سکھ حضرات مقابلۃً کوئی کثیر التعداد جماعت نہیں ہیں مگر میں نے دیکھا کہ امریکا کی درسگاہوں میں جا بجا سکھ اساتذہ اور محققین موجود تھے، یہاں تک کہ ایک بہت بڑی شمالی یونیورسٹی میں "بھارتی تمدن" کے علاوہ "اسلامی تمدن" کا مضمون بھی ایک سکھ فاضل ہی پڑھا رہے تھے!

بہرحال علاقوں، تمدنوں اور زبانوں کو اس طرح خلط ملط کرنے کا نتیجہ میرے دورۂ غالب کے لیے کبھی کبھی یوں بھی نکلا کہ ایک یونیورسٹی میں غالب پر میرے لکچر کی صدارت عراق کے ایک عرب عالم نے کی جو فارسی یا اردو مطلق نہیں جانتے تھے۔ یہ ذکر علی الخصوص اس لیے کر رہا ہوں کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مجھے ڈاکٹر آنا ماری شمل کے زیر صدارت غالب پر تقریر کرنے کا موقع ملا، جن سے بہتر صدر اس موضوع پر امریکا بھر میں میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ امریکا کے روشن ضمیر سامعین نے بھی جا بجا مجھ سے بہت تعاون کیا۔ ایک جگہ مجھے "غالب کی شاعری میں ہیئت و مضمون کا امتزاج" موضوعِ بحث بنانا پڑا۔ یہاں سو میل کے دائرے کے اندر سے ہمسایہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ و محققین ازراہِ کرم جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں نے اپنا یہ لکچر بصد معذرت شروع کیا تھا لیکن جب لکچر ختم ہوا تو حاضرین نے اٹھ اٹھ کر جس گرم جوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ذہین و فطین امریکی سامعین نے ایک نامعروف اور دقیق مضمون کا احاطہ کرنے اور میری مشکل گوئی پر جواباً لبیک کہنے میں شاید کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

یہ تو خالص عقلی تعاون کی ایک مثال تھی مگر اسی سفر کے دوران میں مجھے یہ پُرلطف تجربہ بھی ہوا کہ امریکی سامعین اسلام کے تصورِ حیات کو بے تعصبی سے جانچنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ ایک ذرا سے اشارے پر صدیوں پرانی روایتی منافرت کی دیوار

ڈھے جاتی ہے۔

غالب صدی کی تقریبات مجھے نو یونیورسٹیوں کے علاوہ ایک کالج (گیٹس برگ کالج) میں بھی لے گئیں۔ یہاں مجھ سے خاص طور پر یہ خواہش کی گئی کہ اپنے چار روزہ قیام کے دوران میں چند عام تمدنی موضوعات پر تقریریں کروں۔ ان میں سے تین موضوع حسب ذیل تھے۔

(۱) دینِ اسلام کے بنیادی ارکان۔

(۲) پاکستان و ہند کی اسلامی تہذیب۔

(۳) پاکستان و ہند میں تحریکِ آزادی کے نمایاں پہلو۔

غالب کی شرح کے سلسلے میں اسلام کی حقیقت کا بیان بعض لوگوں کے لیے شاید باعث تعجب ہو لیکن میں نے گیٹس برگ کالج کی یہ درخواست بخوشی منظور کی کیونکہ منطقی طور پر مجھے یہ بالکل جائز معلوم ہوا کہ جس ہند اسلامی تمدن کی ترجمانی کا حق غالب نے ادا کیا، اُس کی ماہیت کو سمجھنے پر بھی کچھ توجہ صرف ہونی چاہیے۔ میرے ان لیکچروں کو سننے کے لیے کالج کے طلبہ و طالبات کے علاوہ بعض بزرگانِ شہر بھی تشریف رکھتے تھے۔ ہر لیکچر کے خاتمے پر رسمی تعریف کے کلمات کہے گئے اور میں نے انھیں اچھی میزبانی کے معمولات میں شمار کیا۔ لیکن میرے خوشگوار استعجاب کا اندازہ کیجیے کہ لاہور واپس پہنچ جانے کے مہینہ بھر بعد مجھے غیر متوقع طور پر گیٹس برگ کے ایک بزرگ کا اس مضمون کا خط موصول ہوا:

"یہ چند سطور شکریے کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ آپ ہمارے ہاں گیٹس برگ کالج میں تشریف لائے۔ آپ کا آنا اس سال کے پُرمسرت واقعات میں سے تھا۔ میک ریری ہال میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کے موازنے پر آپ کا لیکچر اُن عمدہ ترین لیکچروں میں سے تھا جو میرے سُننے میں آئے ہیں۔"

میرے نزدیک اس غیر مترقبہ داد و تحسین کا موقع صرف اس لیے پیدا ہوا کہ اس سے پہلے گیٹس برگ میں شاید کسی شخص کو خدا و رسول کا نام لینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نیز اس شہر کے بے تعصب سامعین کے گوشِ حق نیوش میں جب اسلام اور اسلامی تہذیب کے متعلق چند بنیادی حقائق پہلی مرتبہ پڑے تو انھوں نے بڑی فراخ دلی سے ان حقائق کو قبول کیا۔

امریکا کی تمام تعلیم گاہوں میں پاکستانی اربابِ علم و فضل کی کمی دوسرے ایشیائی ممالک کے اساتذہ

کی کثرت کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پاکستان کا سیاسی نظریہ، اسلام اور اسلامی تہذیب، کا تصوّر اور اس نوعیت کے دوسرے معاملات دنیا کے ایک عظیم الشان اور طاقتور ملک کے اکثر علمی مراکز میں گذشتہ طاقِ نسیاں بنے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے پر امریکا میں ایک بھارتی اہلِ علم نے میرے لیے عجیب تبصرہ کیا۔ فرمایا: "معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں ملازمت کے موقعے (Job opportunities) اس کثرت سے مہیا ہیں کہ پاکستان کے فارغ التحصیل نوجوان امریکا میں رُک جانے کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے!"

خیر، ذکر تو مرزا غالب کی ادبی عظمت کا تھا۔ بوسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر داؤد رہبر غالب کے خطوط کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ترجمہ ایشیا سوسائٹی (نیویارک) کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ کئی جگہ میری تقریر کے بعد یہ اتفاق بھی پیش آیا کہ حاضرینِ جلسہ میں سے بعض نے پوچھا کہ غالب پر انگریزی زبان میں کون کون سی کتاب شائع ہو چکی ہے؟ جواب میں میرے لیے صرف اُن معدودے چند کتابوں کا نام لینا ممکن تھا جو حال ہی میں دہلی، لاہور، روما اور لندن سے انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کتابیں (یا ان میں سے بیشتر) امریکا میں دستیاب نہ تھیں۔ ناچار اُن خواتین و حضرات نے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے تھے، کتابوں کے غیر ملکی ناشرین کے پتے قلمبند کر لیے۔

پروفیسر مجیب کے جو دو لیکچر میں نے سُنے اُن میں سے ایک کا موضوع تھا: "اسلام اور آزادیٔ ضمیر" دوسرے کا موضوع "غالب اور ایملی ڈکنسن" تھا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بھی میری طرح دس بیس جگہ غالب اور اسلام کا نام لیا ہوگا لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مغربی دنیا میں غالب فہمی کی کوشش اُس وقت تک کامیاب نہ ہوگی جب تک یورپ اور امریکا کے اہلِ علم اُس ہزار سالہ تمدّن کی علمی، فنی اور معاشرتی روایت کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے جس کے زیرِ اثر اُنیسویں صدی کے ہندوستان میں مرزا غالب کا ظہور ہوا۔